شاہ ولی اللہ کے چند روحانی مکاشفات

پروفیسر ضیاء

شاہ ولی اللہ صاحب کا دور بڑا خلفشار کا دور تھا۔ مذہبی، فکری اور اخلاقی لحاظ سے بھی، اور معاشرتی اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے بھی۔ اکبر اعظم کے عہد حکومت تک مسلمان اہل علم کی فکری سرگرمیوں کے سامنے ان کے ارباب اقتدار نے گویا ایک بند سا باندھ رکھا تھا۔ جب اکبر نے دربار شاہی میں کھلے بندوں آزاد خیالی کی حوصلہ افزائی کی، تو یہ بند یک بارگی ٹوٹا، اور اسلامی ذہن اس "علم" کی جو صرف فقہ حنفی یا تھوڑے سے منطق و فلسفہ[2] تک محدود تھا، اور اس حکمت کی جس سے مراد بس صوفیانہ معرفت ہوتی تھی، تنگنائیوں سے نکلا۔ اور اس نے اپنے لئے فکر و نظر کی وسیع و عریض دنیاؤں کی تلاش شروع کر دی،

---

[1] "اس ملک میں جب اسلام آیا تو دین کا سارا ذخیرہ بحمد اللہ منقح ہو چکا تھا۔ حدیثوں کی تنقیح ہو چکی تھی۔ فقہ کے اصول منضبط ہو چکے تھے۔ یہاں کے اہل علم کو یہ ساری چیزیں پکی پکائی حالت میں ملی تھیں۔ اس لئے مذہب کے متعلق صرف عمل کا کام رہ گیا تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ حوادث یومیہ جو لامحدود ہیں، ان کے متعلق فقہی کلیات کی روشنی میں حکم پیدا کرنا۔ اس وقت تک اس ملک کے مذہبی دائروں میں نہ فساد تھا نہ جھگڑے۔ ایک روح پرور سکون کا عالم تھا، جو طاری تھا۔"

"تقریباً صدیوں اس ملک کے مسلمانوں میں شیعہ اور سنی یا حنفی و شافعی کے اختلافات بھی نہیں پائے جاتے تھے۔ سب کا ایک مسلک ایک مشرب تھا۔" یعنی سب حنفی تھے۔

(از ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی)

[2] "دو سو سال یعنی سکندر لودھی کے زمانے تک معقولات کا جتنا حصہ ہمارے نصاب میں پایا جاتا ہے وہ صرف قطبی اور شرح صحائف تک محدود تھا۔" (ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلیم و تربیت)

اور بغیر کسی سیاسی بندش کے، جو اکبری دور سے پہلے عام و ہمہ گیر تھی، وہ حقیقت کی جستجو میں یا خود اپنی برسوں کی پیاس بجھانے کے لئے سرگرداں چل نکلا اور ظاہر ہے اس میں وہ بھٹکا بھی۔ اور اس سے کافی لغزشیں بھی ہوئیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اکبر اعظم کے بعد وہ بند ٹوٹ گیا تھا جس نے کئی سو سال تک برصغیر کے اسلامی ذہن کو ایک محدود علمی احاطہ میں پابند کر رکھا تھا۔

آزاد خیالی کا دور

اکبر اعظم کے دور سے ترکوں اور ترکوں کے ساتھ ترکستان اور ماوراء النہر سے آنے والے علوم و افکار کے علاوہ ایرانیوں اور ایرانیوں کے ساتھ ایران سے آنے والے علوم و افکار کا بھی اس برصغیر میں عمل دخل شروع ہوتا ہے، جس کا دائرۂ اثر و نفوذ وقت کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتا گیا۔ اس کے علاوہ جب مغلیہ دور میں حکمراں مسلمانوں اور ان کے حلیف ہندو راجپوتوں میں زیادہ ربط ضبط بڑھا اور دونوں کم و بیش ایک ہی سطح پر آپس میں ملنے جلنے لگے، تو قدرتاً ہندو فلسفہ و حکمت کے دریچے بھی مسلمان اہل علم کے لئے کھل گئے۔ اور اس سے ان کی پہلے کی سی اجنبیت و وحشت نہ رہی۔ اسی زمانے میں یورپی طالع آزما بھی برصغیر کا قصد کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں تاجر بھی تھے، ڈاکٹر بھی، جن میں سے ایک نے شاہ جہاں کی بیٹی کا علاج کیا تھا۔ سیاح بھی تھے، اہل علم بھی اور دین مسیحی کی تبلیغ کرنے والے مشنری بھی۔ ایک فرانسیسی سیاح برنیر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں آیا تھا وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ مجھ سے اورنگ زیب کا ایک سردار دانش مند خاں ڈیکارٹ کا فلسفہ پڑھتا تھا۔ جہاں تک عیسائی مشنریوں کا تعلق ہے جب وہ دربار شاہی تک پہنچ جایا کرتے تھے تو یقیناً وہ دوسرے دوائر میں بھی اپنے مذہبی خیالات کی نشر و اشاعت میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھتے ہوں گے۔

غرض مختلف قوموں کے افراد کا خلا ملا، ان کے تہذیبی اثرات کی درآمد اور پھر ان کے طرح طرح کے خیالات کی ریل پیل، ان سب نے مل کر اکبر اعظم کے دور میں ایک زبردست ذہنی خلفشار پیدا کر دیا تھا۔ جو اس کے جانشینوں کے عہد میں بھی جاری رہا۔ اورنگ زیب کے دور حکومت کے اواخر میں جب کہ شاہ ولی اللہ صاحب پیدا ہوتے ہیں، دہلی کی کم و بیش وہی ذہنی کیفیت تھی جو کوئی ۶۰۰ سال قبل بغداد کی تھی۔ جب امام غزالی وہاں پہنچے ہیں[1]

---

[1] "نیشاپور وغیرہ میں سلجوقیہ کے اثر کی بدولت دوسرے مذاہب کا بہت کم چرچا تھا۔ (باقی حاشیہ ۷ پر)

یہ تو تھی اس دور میں دہلی کے خلفشار کے حالت۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خلفشار اس وقت اس کی سیاست معیشت، معاشرت اور اخلاقی زندگی میں برپا تھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب جب پیدا ہوئے تو اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی۔ چار برس کے تھے کہ عالمگیر کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کے بعد گیارہ سال کے قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے پانچ بادشاہ دہلی کے تخت پر بیٹھے اور ۱۱۳۱ھ میں شاہ صاحب نے اپنے والد کے مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو چھٹے بادشاہ محمد شاہ کے سر پر ہندوستان کا تاج شاہی رکھا گیا، اس کی حکومت کے بارہ سال دیکھ کر آپ حج کو گئے۔

دہلی کے یہ انتیس سال بڑے سخت سیاسی خلفشار میں گزرے، عالمگیر کے مرتے ہی اس کے تین بیٹوں میں لڑائی ہوئی، دو تو میدان جنگ میں کام آئے، اور بڑا بیٹا بادشاہ بنا۔ چار سال حکومت کرنے کے بعد وہ راہی ملک عدم ہوا تو اس کا بیٹا جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا اور ایک سال کے اندر اندر اپنے بھتیجے فرخ سیر کے ہاتھ سے مارا گیا فرخ سیر کو سادات بارہ نے بادشاہ بنایا تھا۔ لیکن ان میں اور بادشاہ میں زیادہ دیر تک نبھ نہ سکی۔ چنانچہ طرفین ایک دوسرے کو گرانے کی برابر کوشش کرتے رہے جس کا آخر میں نتیجہ یہ نکلا کہ فرخ سیر کو سادات بارہ نے سخت عقوبتوں کے بعد مار ڈالا۔ چند ماہ کے اندر دو اور بادشاہ تخت پر بیٹھے اور پھر محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا، اس پر دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ نظام الملک نے سادات بارہ کو شکست دے کر بادشاہ کو ان کے پنجے سے نجات دلائی۔ یہاں سے محمد شاہ کا دور حکومت جسے تاریخ میں "رنگیلا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ) لیکن بغداد دنیا بھر کے عقائد اور خیالات کا دنگل تھا۔ اس زمین پر قدم رکھ کر ہر شخص پورا آزاد ہو جاتا تھا اور جو کچھ چاہتا تھا کہہ سکتا تھا۔ شیعی، سنی، معتزلی، زندیق، ملحد، مجوسی عیسائی بغداد ہی کے دنگل میں باہم علمی لڑائیاں لڑتے تھے اور کوئی شخص ان سے معترض نہیں ہو سکتا تھا۔ اس آزادی کی بدولت ہر قسم کے مختلف عقائد و خیالات پھیلے ہوئے تھے" الغزالی مصنفہ مولانا شبلی

لیکن جہاں تک سیاسی حکمرانوں کا تعلق تھا وہ آسانی سے اس قسم کی آزاد خیالی کو برداشت نہیں کرتے تھے اسی طرح مذہبی طبقے بھی اس معاملے میں زیادہ تر روادار نہیں تھے، اسی لئے امام غزالی کو اپنی تصنیفات میں دو پیرایۂ بیان اختیار کرنے پڑے۔ ایک عوام کے لئے اور دوسرا خواص کے لئے لیکن اس کے باوجود وہ اہل مذہب کے مطاعن سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان پر اعتزال کا شبہ کیا گیا۔

شروع ہوتا ہے۔

اس طرح اور اتنی جلد جلد بادشاہوں کے بدلنے سے ایک طرف مغل سلطنت کا وہ رعب و دبدبہ جو اکبر جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کی طویل اور مضبوط حکومتوں کی وجہ سے قائم ہو چکا تھا، کمزور پڑنے لگا۔ چنانچہ ملک میں ہر طرف شورشیں شروع ہو گئیں۔ دوسری طرف شاہی خاندان کی باہمی جنگوں نے امرائے سلطنت کو خود سر بنا دیا۔ اور وہ ایک دوسرے کے خلاف مرہٹوں، راجپوتوں اور جاٹوں سے مدد لینے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان قوموں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اکبر و عالمگیر کے جانشینوں کا بس نام ہی رہ گیا ہے اور مغلیہ سلطنت کو پوری طرح گھن لگ چکا ہے۔ محمد شاہ اگر کسی قابل ہوتا تو شاید اس کے عہد حکومت میں جو خلاف توقع کافی لمبا تھا، مغل سلطنت کی کچھ حالت سدھر جاتی، لیکن وہ تو محض عیش و عشرت کا بندہ تھا، ہوا یہ کہ معاملات روز بروز زیادہ خراب ہوتے گئے اور شاہ صاحب کی حج سے واپسی کے چند سال بعد تو نادر شاہ کے حملے اور دہلی کی تباہی سے سلطنت کا سارا بھرم ہی جاتا رہا۔

یہ تھی سلطنت دہلی کی حالت، جو شاہ صاحب اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے یہی وہ زمانہ ہے جس میں مرہٹوں کو طرح طرح کی مراعات دی گئیں۔ اور بادشاہ کی طرف سے انہیں دکن سے چوتھ وصول کرنے کا حق عطا ہوا۔ اس سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے اور وہ شمالی ہند پر قابض ہونے کی تدبیریں کرنے لگے۔ راجپوتوں کو مطمئن کرنے کے لئے جزیہ کی منسوخی کا اعلان ہوا۔ ادھر دہلی کے قریب آگرے کے نواح میں جاٹوں نے سر اٹھایا، اور پنجاب میں سکھوں نے شورشیں کرنی شروع کر دیں۔ گو ان سب کو وقتی طور پر دبا دیا گیا لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ "کفار" کا سیلاب بڑھتا چلا جا رہا ہے، اور اس کا روکنا اب روز بروز مشکل ہوتا جائے گا۔

اب شاہ صاحب کا اسلامی سلطنت کے اس خارجی اور داخلی خطرے سے متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت برصغیر کی مسلم حکومت کو جن غیر مسلم طبقوں سے کوئی خطرہ ہو سکتا تھا تو وہ یہی مرہٹے، راجپوت، سکھ اور جاٹ ہی تھے۔ انگریز اور فرانسیسی اس زمانے تک دہلی سے بہت دور تھے، اور ان کا اثر بمشکل ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے آگے بڑھنے پایا تھا، ہمارے خیال میں شاہ صاحب کو اس نئے خطرے کا جو حقیقت میں سب سے بڑا خطرہ تھا، زیادہ علم نہ تھا اب مسلمانوں کو اور اسلامی سلطنت کو اوپر کے غیر مسلم طبقوں کے اس خطرے میں گھرا ہوا پا کر یقیناً شاہ صاحب کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہوگا کہ کوئی ایسی تدبیر ہو جس سے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت درست ہو جائے، ان کی جمعیت کا شیرازہ پھر سے بندھ جائے

مسلمان امراء میں اتفاق و اتحاد ہو، ان کے اخلاق سدھر جائیں اور اس طرح مسلمانوں کو نئی زندگی ملے اور اسلامی سلطنت تباہی کے اس نرغے سے نکل جائے۔ چنانچہ اس کے لئے ضرورت تھی کہ شیعہ اور سنی نزاع ختم ہو۔ اہل تصوف اور ارباب شریعت میں جو بُعد پیدا ہو گیا تھا، وہ نہ رہے۔ علماء اپنا کام کریں اور صوفیا اپنے فرائض انجام دیں، اسلام کی صحیح تعلیمات لوگوں تک پہنچیں اور دین کی تجدید کے ساتھ ساتھ ملت کی بھی نئی تشکیل ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی طبیعت، ان کی عالی دماغی اور بلند حوصلگی، ان کے خاندانی حالات، ان کے ماحول اور جس فضا میں کہ انہوں نے پرورش پائی تھی، ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ وہ اسلامی سلطنت کے زوال سے کتنے متاثر ہوئے ہونگے۔ اور اصلاح حال کے لئے انہوں نے کیا کیا نہ سوچا ہوگا اور کیا کیا ولولے اور کیسی کیسی امنگیں اس سلسلہ میں ان کے دل میں نہ اٹھی ہوں گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں مسلمان صوفی اور مسلمان عالم اسلامی جمعیت کے اہم رکن سمجھے جاتے تھے۔ ایک طرف عوام وخواص ان کے عقیدت مند ہوتے تھے، اور دوسری طرف امراء اور بادشاہ ان کی بات سنتے تھے۔ اور پھر یہ بھی تھا کہ اس عہد میں بالعموم اور شاہ صاحب کے خاندان اور ان کے قریبی ماحول میں بالخصوص حضرت مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارناموں کا غلغلہ تھا۔ اور یہ ممکن نہیں کہ شاہ صاحب کے کانوں میں بچپن ہی سے مجدد صاحب کی باتیں نہ پڑتی رہی ہوں کہ کس طرح انہوں نے جہانگیر کے عہد میں اکبر کے لگائے ہوئے الحاد و زندقہ کے پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا مغلوں کی خلافتِ ظاہرہ کے بالمقابل اپنی باطنی خلافت کی بنیاد رکھی، اور کس طرح ان کے خلفاء اور نائب ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ عوام ان سے متاثر ہوئے اور امراء نے ان کی بات مانی اور آگے چل کر ان کی یہی کوششیں عالمگیر کی حکومت کی صورت میں بار آور ہوئیں۔

یقیناً شاہ صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی کے متعلق یہ سب کچھ سنا ہوگا اور قدرتاً ان کے بلند حوصلوں کو حضرت مجدد کے اسوۂ عمل سے اور آپ کے بارے میں ان روایات و آثار سے جو شاہ صاحب کے ماحول میں رچ چکے تھے بڑی تقویت ملی ہوگی اور ان کو رہ رہ کر یہ خیال آتا ہوگا کہ اگر حضرت مجدد اپنے تجدیدی مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں، تو اس وقت بھی ایک تجدیدی کوشش کر دیکھنی چاہیئے کچھ بعید نہیں کہ اس سے اسلامی جمعیت تباہی سے بچ جائے۔ اور ہندوستان میں اسلام کو نئی زندگی نصیب ہو۔ یہ خیالات یہ ولولے اور یہ امنگیں تھیں جن کو دل میں لئے ہوئے حضرت شاہ صاحب خانہ کعبہ اور روضۂ اطہر پر پہنچے اس وقت آپ کی [illegible] تیس کی عمر تھی۔ جوانی کا عالم تھا تصوف کے مراقبوں سے نفس کی باطنی قوتوں کو بڑی

جلا مل چکی تھی۔ غیر معمولی ذہانت، اس پر وجدانی زندگی کا اتنا پختہ رنگ۔ دل میں بڑھے ہوئے حوصلے اور گرد و پیش کے خطرات کا اس قدر احساس اور دماغ میں بڑے بڑے بزرگوں کی انقلاب آفریں شخصیتیں سمائی ہوئی تھیں۔

خانہ کعبہ اور روضہ اطہر پر حاضری

خانہ کعبہ اور روضۂ اطہر پر روحانی مشاہدات اور مکاشفات کی صورت میں شاہ ولی اللہ صاحب پر جو فیضان ہوا، وہ انہوں نے اپنی کتاب "فیوض الحرمین" میں قلم بند فرمایا ہے۔ اس کتاب میں ان تمام مسائل کے بارے میں شاہ صاحب کا بنیادی نقطۂ نظر آگیا ہے، جو اس دور میں شاہ صاحب کے سامنے تھے۔ آپ "فیوض الحرمین" کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔

> اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت، جس سے اس نے مجھے سرفراز فرمایا یہ ہے کہ ۱۱۴۳ھ اور اس کے بعد کے سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے مقدس گھر کے حج کی اور اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی توفیق بخشی لیکن اس سلسلے میں اس نعمت سے بھی کہیں زیادہ بڑی سعادت جو مجھے میسر آئی وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس حج کو میرے لئے مشاہداتِ باطنی اور معرفتِ حقائق کا ذریعہ بنایا..... اور اسی طرح اس نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس زیارت کو میرے لئے بصیرت افروز بنایا..... الغرض اس حج و زیارت کے ضمن میں مجھے جو نعمتیں عطا کی گئیں وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہے اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حج کے ان مشاہداتِ باطنی میں جو اسرار و رموز مجھے تلقین فرمائے ہیں، ان کو ضبطِ تحریر میں لے آؤں۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت سے اپنی زیارت کے دوران جو کچھ میں نے استفادہ کیا ہے اس کو لکھ دوں تاکہ ایک تو یہ چیز خود میرے لئے ایک یادداشت کا کام دے دوسرے میرے اور بھائیوں کو اس سے بصیرت حاصل ہو سکے۔"

ان سطور میں "فیوض الحرمین" کے بعض مبحوث عنہا مسائل کا مجملاً خلاصہ دیا جاتا ہے۔

الہیات

شاہ صاحب کے زمانے میں فلسفہ وحکمت کا سب سے متنازع فیہ مسئلہ وحدت الوجود کا تھا۔ اور اس کے لئے تخلیق کائنات کی تشریح ضروری تھی۔ اس بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔

" ذات حق نے ارادہ کیا۔ اس کے ارادہ کرنے سے کائنات کا سلسلہ وجود میں آگیا"۔ اھ ذات حق کا کائنات کی تخلیق کا یہ ارادہ اس کے کمال کا ایک لازمہ ہے۔ ذات حق سے کائنات کی یہ تخلیق تدریجی ہے اور اس کا ظہور بذریعہ تنزلات ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نزدیک بنی نوع انسان کے ہر ہر فرد کے دل کی گہرائیوں میں، اس کے جوہر نفس میں اور اس کی اصل بناوٹ میں اللہ تعالےٰ کو جاننے کی استعداد رکھی گئی ہے، لیکن انسانوں کی اس استعداد پر اکثر پردے پڑ جاتے ہیں۔ انبیاء اور مصلحین جو مبعوث ہوتے ہیں، ان کا کام دراصل انسانوں کی اسی فطری استعداد سے ان پردوں کو ہٹانا ہوتا ہے۔

شاہ صاحب نے "فیوض الحرمین" میں "تدلّی" پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ذات حق کے لامحدود کمالات میں سے جب اس کا کوئی کمال اس عالم میں اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عنوان بن جاتا ہے ذات حق کا، تو ذات حق کے کمال کے اس طرح ظہور پذیر ہونے کو تدلّی کہتے ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

> تمہیں جاننا چاہیئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ایک عظیم الشان تدلّی ہے، جو خلق کی طرف متوجہ ہے۔ لوگ اسی تدلّی کے ذریعہ ہدایت پاتے ہیں۔ اس تدلّی کی ہر زمانے میں ایک نئی "شان" ہوتی ہے چنانچہ وہ ایک زمانے میں ایک مظہر میں ظاہر ہوتی ہے اور دوسرے زمانے میں دوسرے مظہر میں، اور جب کبھی یہ تدلّی کسی خاص مظہر میں ظاہر ہوتی ہے تو اس مظہر کا عنوان "رسول" ہوتا ہے۔"

شاہ صاحب کا کہنا ہے "میں نے اس تدلّی کو اپنی ذات میں ایک ہے، دیکھا اور یہ پایا کہ جیسے جیسے خارجی حالات واسباب ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے وہ طرح طرح کے مظاہر میں صورت پذیر ہوتی ہے۔ خارجی حالات واسباب سے میری مراد لوگوں کی عادات واطوار اور ان کے ذہنوں میں جو علوم مرکوز ہوتے ہیں، ان سے ہے"

دوسرے لفظوں میں ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت آتی ہے، وہ اس زمانے کے مذاق اور اس کی خصوصیات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوتی ہے اور بقول شاہ صاحب، یہ اس لئے کہ جہانتک تدلّی اور شعائر کے ظہور کا تعلق ہے، تو لوگوں کے جو مسلّمات ہوتے ہیں، اور جو چیزیں ان کے ہاں مشہور ہوتی ہیں اور لوگوں کے دل ان سے مطمئن ہوتے ہیں، تدلّی اور شعائر ان چیزوں ہی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی تدلّی کا ظہور ہوتا ہے لوگوں کے مسلّمات ہی اس کے نزول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ آخر تدلّی سے اللہ تعالیٰ کا مقصد تو یہی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ جہاں تک کہ ان سے ہو سکے، اس کی اطاعت کریں اور اپنے اعضاء و جوارح کو اعمال نیک کا عادی بنائیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تدلّی لوگوں کے لئے مانوس صورتوں میں ظاہر ہو

شاہ صاحب اس ضمن میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس تدلّی کے مختلف زمانوں میں مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہونے کی حکمت اور پھر اس تدلّی کی ایک صورت کی دوسری صورت سے جو وجہ امتیاز ہے اور جو دراصل نتیجہ ہوتی ہے ان خارجی حالات و اسباب کا، جو اس تدلّی کے ظہور کا باعث بنتے ہیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے مجھے اس حکمت اور اس وجہ امتیاز سے آگاہ فرمایا۔

وحدت الوجود

شاہ صاحب نے وحدت الوجود کے متعلق یہ فرمایا۔ بے شک وحدت الوجود کا مسئلہ علوم حقہ میں سے ہے اور ذاتِ حق میں کل موجودات کو گم ہوتے دیکھنا بھی امر واقعہ ہے، لیکن اس حقیقت تک رسائی کا انحصار طبیعت کی استعداد پر ہے۔

اس بارے میں شاہ صاحب کو یہ مشاہدہ ہوا:۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ والوں کی ایک بہت بڑی جماعت ہے۔ اور ان میں ایک گروہ ذکر و اذکار کرنے والوں اور نسبتِ یادداشت[1] کے حاملوں کا ہے ان کے دلوں پر انوار جلوہ گر ہیں اور ان کے چہروں پر تر و تازگی اور حسن و جمال کے آثار نمایاں ہیں۔ اور یہ لوگ عقیدہ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اللہ والوں کی اس جماعت میں ایک دوسرا گروہ بھی ہے، جو عقیدہ وحدت الوجود کو

---

[1] اللہ تعالیٰ کی طرف الفاظ اور تخیلات سے مجرد ہو کر توجہ کرنا۔

ماتا ہے اور اس کائنات میں ذات باری کے وجود کے جاری و ساری ہونے کے متعلق وہ کسی نہ کسی شکل میں غور و فکر کرنے میں مشغول بھی ہے اور چونکہ اس غور و فکر کے ضمن میں ان سے ذات حق کے بارے میں جو کل عالم کے انتظام میں بالعموم اور نفوس انسانی کی تدبیر میں بالخصوص مصروف ہے، کچھ تقصیر ہوئی ہے اس لئے میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ندامت ہے اور ان کے چہرے سیاہ ہیں اور ان پر خاک اڑ رہی ہے۔

میں نے ان دونوں گروہوں کو آپس میں بحث کرتا پایا۔ ذکر و اذکار والے کہہ رہے تھے کہ کیا تم ان انوار اور اس حسن و تازگی کو نہیں دیکھتے جن سے ہم بہرہ یاب ہیں اور کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ ہمارا طریقہ تم سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔ ان کے خلاف عقیدہ وحدت الوجود کے قائل کہہ رہے تھے کہ کیا ذاتِ حق میں کل موجودات کا سما جانا یا گم ہو جانا امر واقعہ نہیں۔ اب صورت یہ ہے کہ ہم نے اس راز کو پالیا۔ جس سے تم بے خبر رہے۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں تم پر ہمیں فضیلت حاصل ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

ان دونوں گروہوں میں اس بحث نے جب ایک طویل نزاع کی شکل اختیار کر لی تو انہوں نے مجھے اپنا حکم بنایا۔ اس مسئلے کو فیصلے کے لئے میرے سامنے پیش کیا اور میں نے ان کا حکم بننا منظور کیا۔

اس بارے میں شاہ صاحب کا فیصلہ یہ ہے۔

اللہ تعالےٰ نے نفوس انسانی میں الگ الگ استعدادیں ودیعت فرمائی ہیں۔ اور ان نفوس میں سے ہر ہر نفس اپنی اپنی استعداد کے مطابق علوم حقہ کا ذوق رکھتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی نفس علوم حقہ میں سے ان علوم میں جو خاص اس کے ذوق کے مطابق ہوتے ہیں اور ان سے اس کی طبیعت کو مناسبت ہوتی ہے، پوری طرح مستغرق ہو جاتا ہے، تو اس کی وجہ سے اس نفس کی تہذیب و اصلاح ہو جاتی ہے۔ بے شک وحدت الوجود کا یہ مسئلہ جو اس وقت مابہ النزاع ہے، واقعہ یہ ہے کہ علوم حقہ میں سے ہے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ تم دونوں کے دونوں گروہ نہ تو اس کے اہل تھے اور نہ یہ چیز تمہارے ذوق اور مشرب کے مطابق تھی۔

پھر شاہ صاحب کا ارشاد ہے:۔ وہ لوگ جو وحدت الوجود پر اعتقاد رکھتے تھے، لیکن یہ علوم ان کے ذوق اور مشرب کے مطابق نہ تھے، انہوں نے اپنے خیالات کو فکر کی اس وادی میں جہاں کہ یہ سوال

درپیش ہوتا ہے کہ موجودات عالم میں وجود حق کس طرح جاری وساری ہے، بے عنان چھوڑا تو ان کے ہاتھ سے ذات حق کی تعظیم، اس سے محبت اور موجودات سے اس کے ماوراء اور منزہ ہونے کا سررشتہ چھوٹ گیا ... اور اس کی وجہ سے نہ تو ان کی تہذیب واصلاح ہوسکی اور نہ وہ اپنے مقصد حیات ہی کو پاسکے۔

اسی سلسلے میں آپ نے ایک تمثیل بیان فرمائی ہے۔

میں روح آفتاب سے ملا اور میں نے اس سے کہا کہ اے روح آفتاب لوگ تجھ سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہر رنگ اور ہر طور میں تیرا غلبہ اور ظہور دیکھنے کے باوجود تیرا انکار کرتے اور تیرے خلاف جھوٹے باندھتے ہیں لیکن تیری حالت یہ ہے کہ نہ تو ان سے انتقام لیتی ہے اور نہ ان پر خفا ہوتی ہے یہ سنکر روح آفتاب بولی کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان لوگوں کا غرور اور تکبر نیز ان کا اپنے آپ میں پھولا نہ سمانا خود خود میری اپنی ذاتی سرخی کا ایک مظہر ہے اور یہی وجہ ہے کہ میری نظر ان لوگوں کے غرور و تکبر کی طرف نہیں جاتی بلکہ میں تو ان لوگوں کی خوشی و شادمانی کو دیکھتی ہوں اور جانتی ہوں کہ یہ سب میری اپنی خوشی و شادمانی کا ایک پرتو ہے اس بات کو جانتے ہوئے کیا یہ جائز ہے کہ کوئی خود اپنے ذاتی کمال پر بگڑے یا کوئی اپنی ذات سے انتقام لے

شریعتیں

رشد وہدایت کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے چلا آرہا ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں۔ ان مذاہب کی شریعتوں کا خارجی حالات سے مطابق ہونا ضروری ہے اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔ شریعتوں کے احکام کی تشکیل لوگوں کی عادات کے مطابق ہوتی ہے اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب کسی شریعت کی تشکیل ہونے لگتی ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ لوگوں کی عادات پر نظر ڈالتا ہے جو عادتیں بُری ہوتی ہیں ان کو ترک کرنے کا حکم دیتا ہے اور جو عادتیں اچھی ہوتی ہیں، ان کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک زمانے میں کسی رسول پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، تو جہاں تک اس

زمانے کا تعلق ہوتا ہے وہ قطعی اور آخری حیثیت رکھتی ہے یعنی اس زمانے میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اس شریعت کے اتباع کے بغیر خیر و فلاح حاصل ہو سکے۔ لیکن اگر اس شریعت کو تمام شریعتوں کو سامنے رکھ کر مجموعی نقطہ نظر سے دیکھا جائیگا تو پھر اس کی حیثیت بے شک اضافی ہوگی۔

یہ کیسے معلوم ہو کہ ایک زمانے میں یہی شریعت قطعی و آخری ہے۔ شاہ صاحب اس کی پہچان یہ بتاتے ہیں کہ وہ صالح نفوس کو اپنی طرف کھینچے۔ عقل صحیح اس کی تصدیق کرے۔ اور اس کی وجہ سے اعمال نیک کا ظہور ہو۔

شاہ صاحب کے نزدیک شریعت کی تشکیل تو اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ ہی کرتا ہے لیکن اس شریعت کے لئے مواد اسے اس قوم سے اور اس کے ماحول سے جس میں وہ مبعوث ہوتا ہے، ملتا ہے اسی وجہ سے شریعتیں مختلف زمانوں میں مختلف شکلوں میں آتی رہیں، لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں ایک اساسی وحدت بھی موجود رہی۔ شاہ صاحب کے الفاظ ہیں

> عالم غیب سے جب کوئی فیضان ہوتا ہے، خواہ یہ فیضان روزمرہ کا سا عام فیضان ہو یا یہ فیضان اعجاز اور خارق عادت کی نوعیت کا ہو، بہر حال یہ فیضان محل فیضان کی جو ضروری خصوصیات ہوتی ہیں، انہیں کے لباس میں صورت پذیر ہوتا ہے اور محل فیضان کی یہی خصوصیات اس کو دوسرے فیضان سے جدا کرتی ہیں۔

دین کے شعائر

دین کی اصل اساس تو اللہ تعالیٰ اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لانا ہے، لیکن جب تک ایمان کے ساتھ شعائر نہ ہوں، دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ دین اسلام کے بنیادی شعائر نماز، روزہ حج اور زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔

مختلف مذاہب میں ان شعائر کو بجالانے کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں شاہ صاحب فرماتے ہیں: "ایک گروہ شعائر اللہ کے حقوق ادا کرنے میں صرف اپنی نیت کا پھل پاتا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ گروہ سمجھتا ہے کہ یہ شعائر اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور وہ گروہ ان شعائر کو اللہ کا حکم سمجھ کر بجالاتا ہے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جن کی روح کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اپنے روحانی حاسہ سے شعائر اللہ کا نور محسوس کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی بہیمی قوتوں پر ملکی قوتیں غالب آجاتی ہیں اور

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے، جو شعائر اللہ کے نور میں بالکل ڈوب کر اللہ تعالیٰ کی اس تدلی کو جو ان شعائر کی اصل ہے پالیتے ہیں۔ یعنی ان شعائر کو بجالانے سے بعض لوگ تو قرب الٰہی کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں اور بعض ان کے ذریعہ اپنی پستی قوتوں پر قابو پاتے ہیں اور ان کے اندر جو ملکی قوتیں ہوتی ہیں، وہ انہیں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اور بعض جو محض اللہ کا حکم سمجھکر ان پر عمل کرتے ہیں، اس سے ان کے اندر ایک نظم اور ضبط پیدا ہوجاتا ہے۔

اس ضمن میں وہ نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :۔ تدلی الٰہی کی ایک صورت نماز ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق واطوار کی جو نفسی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے ہر نفسی کیفیت کا خارج میں کوئی نہ کوئی عملی مظہر ہوتا ہے۔ اور یہ عملی مظہر ہی اس عالم محسوس میں اس خلق کی نفسی کیفیت کا مادی قائم مقام بن جاتا ہے۔ اب اخلاق انسان کے یہ عملی مظاہر ذریعہ بن جاتے ہیں نفس میں ان اخلاق کی باطنی کیفیات کی تربیت کا۔

اسلام کا ایک شعار "ملت" ہے۔ شاہ صاحب اس کی شرح یوں فرماتے ہیں :۔ انسانوں کو فطرت کی طرف سے یہ الہام ہوا کہ وہ آپس کے تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے قواعد بنائیں۔ اس الہام کی بنا پر انہوں نے شہری زندگی کے قاعدے بنائے۔ خانہ داری کے طریقے وضع کئے۔ معاشی اور کاروباری دستور مرتب کئے۔ چنانچہ اجتماعی زندگی کے لئے قواعد اور دستور بنانے کی یہ عادت ان کی فطرت کا اصل الاصول بن گئی۔ اور اس کا شمار ان کے ہاں ضروری علوم میں سے ہونے لگا۔ جب یہ چیز لوگوں کے دلوں میں راسخ ہوگئی تو اس کے بعد ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کے قلب کو یہ قابلیت بخشی کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ دستور جگہ پکڑ سکے۔ اس دستور میں اللہ تعالیٰ کی روح ہوتی ہے اور اس میں برکت اور نور ہے۔ یہی اللہ کی شریعت اور اس کا نام "ملت" ہے۔

شریعت اور طریقت

شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کی غالب اکثریت اہل سنت تھی۔ ان کی علمی و روحانی قیادت اس وقت علماء یعنی ارباب شریعت اور صوفیاء یعنی اصحاب معرفت کے ہاتھ میں تھی اور ان میں آپس میں چل رہی تھی۔ صوفیاء بالعموم باطنی زندگی کو سب کچھ سمجھے ہوئے تھے اور علماء ظاہری شریعت پر زیادہ زور دیتے تھے۔ شاہ صاحب کے ان شاہکار روحانی میں ان دونوں کو قریب لانے کی بھی راہ دکھائی

گئی ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں :۔ قرب الٰہی کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس عالم میں آئے تو قرب الٰہی کا یہ طریقہ بھی بندوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ قرب الٰہی کے اس طریقے میں واسطوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس کے پیش نظر طاعات و عبادات کے ذریعہ اعضاء جوارح کی اور ذکر و تذکیر اور اللہ اور اس کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کے ذریعہ قوائے نفس کی تہذیب و اصلاح ہوتی ہے چنانچہ عام لوگوں کی تہذیب و اصلاح کے لئے علوم کی نشر و اشاعت، نیک کاموں کا حکم دینا، برائیوں سے روکنا ..... یہ سب کے سب قرب الٰہی کے اس طریقے میں داخل ہیں۔

قرب الٰہی کا دوسرا طریقہ اللہ اور بندے کے براہ راست اتصال کا ہے ..... جو شخص اس طریقہ پر چلتا ہے، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے "انا" کو بیدار کرتا ہے اور اپنے "انا" ہی کی بیداری کے ضمن میں اس کو ذات حق کا تنبہ اور شعور حاصل ہوتا ہے اور اسی سلسلے کے "فنا و بقا" اور جذب و توحید وغیرہ مقامات ہیں۔

شاہ صاحب کے نزدیک قرب الٰہی کا دوسرا طریقہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عالی منزلت تھا اور نہ آپؐ کو یہ مرغوب تھا۔ آپؐ کی ذات اقدس تو قرب الٰہی کے پہلے طریقے کا عنوان تھی اور آپ ہی کے ذریعہ یہ طریقہ عام طور پر پھیلا۔ دوسرا طریقہ تصوف ہے۔

سنت اور فقہ حنفی

اصحاب شریعت اور ارباب تصوف میں تو یہ اختلاف تھا۔ لیکن خود اصحاب شریعت کا شاہ صاحب کے زمانے میں یہ حال تھا کہ وہ فقہی تعصب اور ذہنی جمود میں بُری طرح مبتلا تھے۔ وہ فقہ حنفی کو اسلام کا مرادف سمجھتے اور اس میں اتنا تشدد برتتے کہ کسی کا حنفی نہ ہونا ان کے نزدیک اسلام سے خروج سمجھا جاتا۔ شاہ صاحب کو اس بارے میں ایک مکاشفہ ہوا، جس کا خلاصہ یہ ہے۔

> میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ آپؐ مذاہب فقہ میں سے کس خاص مذہب کی طرف رجحان رکھتے ہیں تاکہ میں فقہ کے اس مذہب کی اطاعت کروں۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے یہ سارے کے سارے مذاہب یکساں ہیں ..... واقعہ یہ ہے کہ آپؐ کی روح کے جوہر

> میں ان تمام فقہی فروعات کا جو بنیادی علم ہے وہ موجود ہے۔ اس بنیادی علم سے مراد یہ ہے کہ نفوس انسانی کے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس عنایت اور اہتمام کو جان لیا جائے، جس کے پیش نظر انسانوں کے اخلاق و اعمال کی اصلاح ہے۔ الغرض فقہ کے تمام قوانین کی اصل بنیاد تو یہ عنایت الٰہی ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے زمانہ بدلتا ہے اس کے مطابق اس اصل سے نئی نئی شاخیں اور الگ الگ صورتیں بنتی چلی جاتی ہیں۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کے اصل جوہر میں فقہ کا یہ بنیادی علم موجود ہے اس لئے ضروری ہے کہ آپؐ کے نزدیک فقہ کے سارے مذاہب برابر ہوں۔

شاہ صاحب کو اس مکاشفے میں یہ القا کیا گیا کہ گو فقہ کے مذاہب ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن جہاں تک فقہ کے ضمن میں دین اسلام کے ضروری اصول و مبادی کا تعلق ہے، فقہ میں سے ہر مذہب میں وہ موجود ہیں مزید برآں شاہ صاحب کو یہ القا بھی ہوا۔

> اگر کوئی شخص فقہ کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کا بھی تابع نہ ہو، تو اس کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ آپؐ اس شخص سے ناراض ہوں۔ ہاں اس سلسلے میں اگر کوئی ایسی بات ہو، جس سے ملت میں اختلاف پیدا ہو، تو ظاہر ہے اس سے بڑھ کر آپؐ کی ناراضگی کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے

اسی لئے شاہ صاحب کو ایک مکاشفے میں یہ بتایا گیا کہ وہ فروعات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں اور یہ کہ فقہ کے یہ جو چار مذاہب ہیں ان کا پابند رہوں اور ان کے دائرے سے باہر نہ نکلوں۔

ایک مشاہدے میں شاہ صاحب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنفی مذہب کے ایک ایسے طریقے سے آگاہ فرمایا، جس میں حنفی مذہب اور احادیث کا اختلاف رفع ہو جاتا ہے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے اقوال میں سے وہ قول لیا جائے، جو مسئلہ زیر بحث میں مشہور احادیث سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ پھر ان فقہائے احناف کے فتاوی کی پیروی کی جائے جو علمائے حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی جہاں تک کہ ان چیزوں کے اصول کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں خاموش رہے اور انہوں نے ان کے بارے میں

ممانعت کا کوئی حکم نہیں دیا۔ لیکن ہمیں ایسی احادیث ملتی ہیں، جن میں ان چیزوں کا ذکر ہے۔ اس حالت میں ان چیزوں کا اثبات لازمی ہے۔ اعمال اور احکام میں اس روش کو اختیار کرنا بھی مذہب حنفی میں داخل ہے۔

ایک اور مشاہدے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔ مجھ پر ایک ایسا مثالی طریقہ منکشف ہوا جس سے مجھے سنت اور فقہ حنفی میں تطبیق دینے کی کیفیت معلوم ہوئی اور وہ اس طرح کہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، اور امام محمد میں سے جس کا قول سنت سے قریب ہو، میں اس قول کو اختیار کر دوں۔ جن امور کو انہوں نے عام رہنے دیا ہے، ان کی تخصیص کر دوں۔ مسائل فقہ کو مرتب کرنے میں جو مقاصد ان بزرگوں کے پیش نظر تھے، ان سے واقف ہوں۔ سنت سے جو عام مفہوم متبادر ہوتا ہے، میں اس پر انحصار رکھوں اور اس معاملے میں نہ تو دور از قیاس تاویل سے کام لیا جائے اور نہ یہ ہو کہ ایک حدیث کو دوسری حدیث سے بھڑایا جائے اور نہ امت کے کسی فرد کے قول کے خیال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کو ترک کیا جائے۔ سنت اور فقہ حنفی میں باہم مطابقت دینے کا یہ طریقہ ایسا ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ اس طریقے کو مکمل کر دے تو یہ دین کے حق میں کبریت احمر اور اکسیر اعظم ثابت ہو۔

شیعہ اور سنی

شاہ صاحب کے زمانے میں شیعہ اور سنی مسئلہ بڑی نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ اب شیعہ امراء کی اتنی کمزور پوزیشن نہیں تھی کہ انہیں نظر انداز کیا جا سکتا۔ سلطنت کے بعض صوبوں میں تو ان کا اقتدار تھا ہی، خود دارالسلطنت میں بھی ان کا کافی زور تھا۔

شیعہ و سنی نزاع کو ختم کرنے کے بارے میں شاہ صاحب کو جو مکاشفے ہوئے۔ ان کا لب لباب یہ ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کس اعتبار سے حضرت علی سے افضل ہیں، باوجود اس کے کہ حضرت علیؓ اس امت کے پہلے صوفی، پہلے مجذوب اور پہلے عارف ہیں۔

شاہ صاحب کو بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک فضیلت کلی کا مدار امور نبوت پر ہے جیسے کہ علم کی اشاعت، لوگوں کو دین کا مطیع و فرماں بردار بنانا۔ اور اس طرح کے اور امور جو نبوت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ فضیلت جس کا مرجع ولایت یعنی جذب اور فنا ہے یہ تو ایک جزئی فضیلت ہے اور ایک اعتبار سے کم درجے کی ۔

..... وہ عنایت الٰہی جس کا مرکز و موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی وہ بعینہٖ ان دونوں بزرگوں کے وجود گرامی میں صورت پذیر ہوئی ..... اور گو حضرت علی نسب کے اعتبار سے نیز اپنی جبلت اور محبوب فطرت کے لحاظ سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے زیادہ آپؐ کے قریب تھے اور جذب میں بھی قوی تر اور معرفت میں بھی بالاتر تھے، لیکن اس کے باوجود آپ منصب نبوت کے کمال کے پیش نظر حضرت علی سے زیادہ حضرت ابوبکر و عمر کی طرف مائل تھے۔

لیکن جہاں تک خود شاہ صاحب کا تعلق ہے وہ فرماتے ہیں "اگر میری طبیعت اور میرے رجحان کو آزاد چھوڑا جاتا تو وہ دونوں حضرت علی کو فضیلت دیتے اور ان سے زیادہ محبت کا اظہار کرتے لیکن مجھے حضرت علی پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو فضیلت دینے کا حکم دیا گیا اور یہ ایک ایسی چیز تھی، جو میری طبیعت کی خواہش کے خلاف عبادت کی طرح مجھ پر عائد کی گئی تھی۔ اور مجھ پر اس کی تعمیل لازمی تھی۔"

قائم الزماں ہونا اور مجددیت، وصایت اور قطبیت کے مقام کا عطا کیا جانا

شاہ صاحب ایک مشاہدے میں لکھتے ہیں کہ میں نے ذی قعدہ کی اکیسویں رات کو ۱۱۴۳ھ میں یہ خواب دیکھا۔ میں قائم الزماں ہوں۔ قائم الزماں سے میری مراد یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جب اس دنیا میں نظام خیر کو قائم کرنے کا ارادہ فرمایا، تو اس نے اپنے اس ارادے کی تکمیل کے لئے مجھے بطور ایک ذریعہ کار کے مقرر کیا۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ کفار کا بادشاہ مسلمانوں کے شہر پر قابض ہوگیا۔ اس نے ان کے مال و متاع لوٹ لئے۔ ان کی اولاد کو اپنا غلام بنالیا۔ اجمیر کے شہر میں کفر کے شعائر اور رسوم کو سربلند کیا۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پیچھے پیچھے لوگ چلے اور انہوں نے اس کافر بادشاہ کو قتل کر دیا۔ جب میں نے اس کی رگوں سے خون کو خوب زور سے بہتے دیکھا تو میں پکار اٹھا کہ اب رحمت نازل ہوئی ہے۔

ایک اور مشاہدے میں شاہ صاحب کو القا ہوا کہ تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ وہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے منتشر اجزا کو جمع کر دے۔ ان کو اسی مشاہدے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ وصیت ہوئی کہ وہ انبیاء کے طریقے کو اختیار کریں۔ ان کے بارہائے گراں کو اٹھائیں اور ان کی خلافت کے لئے کوشاں ہوں۔

ایک اور مشاہدے میں شاہ صاحب کو مختلف مناصب جلیلہ پر سرفراز ہونے کی خوشخبری

دی گئی۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ عظمت کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور جبروت سے مشابہ ہیں۔ اور آپؐ کی ذات اقدس حامل ہے بہت سی لطافتوں کی ..... اس مجلس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مجھے اپنی اجمالی مدد سے سرفراز فرمایا اور یہ اجمالی مدد عبارت تھی مقام مجددیت، ولایت اور قطبیت ارشادیہ سے۔ نیز مجھے شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور امامت بخشی اور تصوف میں میرا جو مسلک ہے، اور فقہ میں میرا جو مذہب ہے، ہر دو کو اصل اور فرع دونوں لحاظ سے راہِ راست پر بتایا، لیکن یہ سب کے لئے نہیں، بلکہ صرف مخصوص لوگوں کے لئے جن کی فطرت میں تحقیق کا مادہ ہے، لیکن اس میں بھی شرط یہ رکھی کہ اس سلکِ تصوف اور مذہب فقہی کا اتباع باہمی اختلاف اور آپس کی لڑائی جھگڑے کا باعث نہ بنے۔ چنانچہ جو شخص بھی فقہ میں اصل اور فرع کے لحاظ سے اور تصوف میں سلوک کے اعتبار سے ہمارے مذہب فقہی اور مسلک تصوف کو اختیار کرے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں مندرجہ بالا نکتہ پر اپنی نگاہ رکھے۔

علوم شرعیہ کے اسرار و حکم جو شاہ صاحب پر منکشف ہوئے ایک مشاہدے میں اس کا ان الفاظ میں ذکر ہے۔

مدینہ منورہ میں قیام کے دوران بالجملہ میرے ساتھ یہ اکثر ہوا کہ جب بھی میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قبر کی طرف متوجہ ہوا، میں نے آپؐ کو حاضر پایا ..... ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں آپ کی طرف متوجہ ہوا اور اس وقت میرے اندر یہ شوق بھرا ہوا تھا کہ انسانی نفوس کے حالات و کوائف کے مطابق مجھے جو شرعی احکام و قواعد کے معارف کو استنباط کرنے اور وجود الٰہی کے مختلف مراتب میں ان کے علوم سے بہرہ ور ہونے کی خصوصیت دی گئی، خدا کرے میرے سامنے اس خصوصیت کی جو اصل حقیقت ہے وہ عیاں ہو جائے۔ میں اس فکر میں تھا کہ میرا نفس ذاتِ اقدسؐ سے ملحق ہو گیا اور اس کی وجہ سے میرے اندر ان علوم و معارف کی خوشی اور ٹھنڈک یکسر سما گئی۔

شاہ صاحب میں دین کے امور میں جو اس قدر وسعتِ فکر و نظر پائی جاتی ہے جس سے بڑھ کر کہ وسعت کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس کا سرّ وہ ایک مشاہدہ میں یوں بیان فرماتے ہیں...

"..... میرے لئے اللہ تعالیٰ کی تدلّی اعظم ظاہر ہوئی، تو میں نے اسے غیر متناہی پایا۔ اور اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا۔ میں نے دیکھا کہ گویا میں ایک غیر متناہی ہوں جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے اور میں

اس غیر متناہی کو اپنے اندر لگل گیا ہوں اور میں نے اس غیر متناہی میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑا۔ اس کے بعد میں نے جو اپنے نفس کی طرف رجوع کیا تو کچھ دیر تک میں اپنے نفس کی اس عظمت اور وسعت سے حیرت میں رہا لیکن پھر یہ حالت مجھ سے جاتی رہی۔۔۔۔"

شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب "فیوض الحرمین" میں کوئی ۷۰ مشاہدے ہیں۔ اور ہر مشاہدے میں اسی طرح کے روحانی کوائف مذکور ہیں۔ شاہ صاحب کے فکر اور عمل نے زیارت حرمین کے بعد اپنے لئے جو راہیں اختیار کیں، فیوض الحرمین کے ان مشاہدات میں ان کی ایک اجمالی جھلک ملتی ہے' یاد رہے یہ سب کچھ جو ان پر فیضان ہوا' یہ اکثر اس حالت میں ہوا جب وہ یا تو خانہ کعبہ میں عبادت کر رہے تھے یا روضہ نبوی کے جوار میں تھے۔ اور واقعہ یہ ہے جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے' حج و زیارت کے ضمن میں جو نعمت انہیں عطا کی گئی' وہ سب سے بلند مرتبہ تھی۔

"تاویل الاحادیث" میں شاہ ولی اللہ صاحب نے ابراہیم علیہ السلام سے لے کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کی زندگی کو اسی حکمت کی نظر سے دیکھا ہے اور ان کی تعلیمات کو تدریجی ترقی کے اسی اصول پر حل کیا ہے۔ ہم نے متقدمین میں سے کسی حکیم کے ہاں اس اہم مسئلے کو اس طرح مدون نہیں پایا۔ ہمارے نزدیک یہ شاہ صاحب کا سب سے بڑا علمی کمال ہے اسی لئے ہم ان کو امام مانتے ہیں۔ یہاں ہم ایک بات کھول کر کہہ دینا چاہتے ہیں۔ اگر کسی صاحب فکر یا عالم کو اوپر کے سلسلۂ بیان میں کسی حصے سے اختلاف ہو تو ہمارے نزدیک اس کا اختلاف کرنا کوئی معیوب بات نہیں۔ ہم شاہ صاحب کی امامت پر محض اس بنا پر زور دیتے ہیں کہ انہوں نے انسانی فکر کو از اول تا آخر ایک تاریخی تسلسل میں مرتب کر دیا ہے جس کی وجہ سے ان تمام انبیاء کی تعلیم میں جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے فکری وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی فکر کی تدریجی ترقی کا تعین اور پھر قرآن سے اس کی مطابقت کرنا یہ خصوصیت ہے شاہ ولی اللہ صاحب کے کمال علم کی' جو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ اور اسی بنا پر ہم انہیں امام مانتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا علم ہے ہم نے کسی بڑے امام کے ہاں اس طرح کا جامع فکر جو تمام انبیاء کی تعلیمات کو ایک رشتۂ خیال میں پرو دے۔ اور ان میں تاریخی تسلسل اور تدریجی ارتقاء ثابت کرے نہیں دیکھا ہماری رائے یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب کی اس حکمت کو تحقیق سے سمجھ لیا جائے تو قرآن عظیم تحت اللفظ پڑھ کر بھی سمجھ میں آسکتا ہے اور اس کی چنداں ضرورت نہیں رہتی کہ آدمی کسی زائد تفسیر کا محتاج ہو۔ (مولانا عبیداللہ سندھیؒ)